ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL

Vol.9. No.1.2026

نجیبہ عارف کے افسانوں میں ملازمت پیشہ عورت کے سماجی ونفسیاتی مسائل کی عکاسی

Representation of Socio-Psychological Issues of Working Women in the Short Stories of Najeeba Arif

ڈاکٹر اقلیمہ ناز

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو زبان وادب

فاطمہ جناح ویمن یونی ورسٹی، راولپنڈی

Dr. Aqlima Naz
Assistant Professor, Department of Urdu Zuban-O-Adab
Fatima Jinnah Women University, Rawalpindi

Abstract

This study examines the socio-psychological issues faced by working women in the short stories of Najeeba Arif. It explores how Arif portrays the complex realities of women who struggle to balance their professional responsibilities with domestic roles within a patriarchal social framework. The analysis highlights that working women in her fiction are often subjected to multiple pressures, including familial expectations, workplace discrimination, and emotional strain. The study further investigates the psychological dimensions of these experiences, particularly the feelings of guilt, inadequacy, and emotional exhaustion that arise from the inability to fully satisfy both professional and personal demands. Arif's narratives reveal that despite education and economic participation, women continue to face subtle forms of marginalization, often reinforced through social attitudes and interpersonal relationships. By focusing on thematic and textual analysis, this paper argues that Arif's short stories present a nuanced depiction of the inner conflicts and external challenges encountered by working women. The concept of "soft patriarchy" is also evident, where indirect pressures and societal norms shape women's identities and limit their autonomy. Ultimately, the study concludes that Najeeba Arif effectively highlights the ongoing struggle of working women to negotiate their identities and achieve a sense of balance in a socially constrained environment.

Keywords

Twenty-first Century Urdu Fiction, Urdu Short Story, Najeeba Arif، Socio-Psychological ،Working Women.

ہر عہد میں سماج میں عورت کو مختلف مسائل اور چیلنجز کا سامنا رہا ہے، مگر اکیسویں صدی میں صورتِ حال کچھ مختلف منظر نامے کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ آج کی عورت نہ صرف تعلیم یافتہ اور بااختیار بننے کی جدوجہد کر رہی ہے بلکہ ملازمت پیشہ ہو کر اپنی معاشی وسماجی خود مختاری قائم کرنے کی کوشش میں بھی مصروف ہے، تاکہ وہ اپنی زندگی کو اپنے وسائل اور محنت کے بل بوتے پر بہتر انداز میں استوار کر سکے۔ کوئی بھی انصاف پسند شخص اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ معاشرے کی تعمیر سازی میں عورت کا اہم کردار ہے۔[1]

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
Vol.9. No.1.2026

اسلام بھی مرد وعورت دونوں کے درمیان اعتدال اور توازن کے اصول کو نہ صرف تسلیم کرتا ہے بلکہ معاشی میدان میں عورت کی شمولیت اور اس کے استحکام کی بھی واضح طور پر حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اس کی روشن مثال حضرت خدیجہؓ کی کاروباری بصیرت اور معاشی خود مختاری ہے، جن کی شخصیت اسلامی تاریخ میں عورت کی معاشی فعالیت کی عملی دلیل کے طور پر موجود ہے۔ اسی طرح دیگر صحابیات کی بھی معاشی خود مختاری کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ قرآنِ کریم میں بھی یہ اصول واضح کیا گیا ہے ۔

> مردوں کے لیے اس میں سے حصہ ہے جو انھوں نے کمایا، اور عورتوں کے لیے اس میں سے حصہ ہے جو انھوں نے کمایا
> ۔ اور اللہ سے اس کے فضل کا سوال کرو۔ بے شک اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔2

تاہم اس مسلسل جدوجہد اور معاشی شمولیت کے باوجود، جدید دور کی عورت ایک گہرے سماجی تضاد کا سامنا کرتی ہے۔ ایک طرف وہ معاشی طور پر خود مختار ہونے کی کوشش میں آگے بڑھ رہی ہے، تو دوسری طرف وہ گھر اور دفتر دونوں سطحوں پر معاشرتی دباؤ، گھریلو ذمہ داریوں اور پدرشاہی توقعات کے بوجھ تلے دبی رہتی ہے۔

> "پاکستان میں خواتین کو ایک گہری دوہری ذمہ داری کا سامنا ہے جو ان کی اقتصادی خود مختاری میں رکاوٹ ہیں۔ یہ ذمہ داریاں پیشہ ورانہ ذمہ داریوں اور روایتی گھریلو ذمہ داریوں کے درمیان تقسیم ہوتی ہیں۔۔۔ اپنے مرد ہم منصبوں کے برعکس، جو عام طور پر صرف اپنے پیشہ ورانہ کردار پر مرکوز ہوتے ہیں، خواتین کو اپنے کام کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ گھر کے انتظام کی ذمہ داریوں کو بھی نبھانا پڑتا ہے۔ یہ دوہری ذمہ داری اکثر انھیں مشکل سمجھوتے کرنے پر مجبور کرتی ہے۔"3

یہ دوہرا دباؤ نہ صرف اس کی پیشہ ورانہ کارکردگی کو متاثر کرتا ہے بلکہ اس کی ذہنی و نفسیاتی صحت پر بھی گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ یہی پیچیدہ سماجی تجربہ اردو افسانے میں بھی بھرپور انداز میں منعکس ہوا ہے، جہاں عورت کی داخلی کشمکش، معاشی جدوجہد اور سماجی جبر کو مختلف فنی زاویوں سے پیش کیا گیا ہے۔

اردو افسانے میں عورت کو درپیش ان چیلنجز کو مختلف زاویوں سے پیش کیا جاتا رہا ہے، اور خصوصاً اکیسویں صدی کے افسانہ نگاروں نے اس موضوع کو نئی فکری جہتوں کے ساتھ برتا ہے۔ اس سلسلے میں نجیبہ عارف نے پڑھی لکھی، باشعور اور ملازمت پیشہ عورت کے سماجی و نفسیاتی مسائل کو اپنی تخلیقات کا مرکز بنایا ہے۔ نجیبہ عارف کا افسانوی اسلوب اور فکری زاویہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ان کے ہاں ادب محض الفاظ کا جمال نہیں بلکہ احساس، تجربے اور شعور کی ایک کائنات بپا ہے۔ انہوں نے اردو ادب کے تقریباً ہر شعبے میں اپنی فکری مہارت اور فنکارانہ جوہر سے وہ نقوش ثبت کیے ہیں جو دیرپا اہمیت کے حامل ہیں۔ تنقید میں ان کی بصیرت ادب کے پوشیدہ پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے، تحقیق میں اُن کا علم و ادراک تاریخ کے اوراق کو نئے زاویوں سے روشن کرتا ہے، شاعری و افسانہ نگاری میں اُن کے فن کی لطافت قاری کو احساس کی نئی دنیاؤں سے آشنا کرتی ہے، جبکہ ترجمہ، تصوف اور حکمت کے میدان میں ان کی کاوشیں ایک وسیع تر فکری کائنات کے در وا کرتی ہیں۔

ان کے افسانوں میں عورت محض ایک کردار نہیں بلکہ ایک ایسا وجود ہے جو عالمی سطح پر حاشیے پر رکھا گیا ہے اور جس کی فردی حیثیت سماجی و تہذیبی نظام کے باعث محدود کر دی گئی ہے۔ نجیبہ عارف عورت کو کسی ضمنی یا ثانوی نوع کے بجائے ایک مکمل انسان اور خود مختار وجود کے طور پر پیش کرتی ہیں۔ درحقیقت ملازمت پیشہ عورت کی یہی داخلی کشمکش اور وجودی تجربہ نجیبہ عارف کے ہاں تخلیقی سچائی کی بنیاد بنتا ہے، جس کے ذریعے وہ عورت کے باطن کی حقیقی تصویر پیش کرتی ہیں۔ نجیبہ عارف کا کہنا ہے۔

> یہ فرد جو اِن میں سے بیشتر افسانوں کا مرکزی کردار ہے، محض ایک فرد نہیں۔ یہ ایک عورت ہے۔ عورت ہونا آج بھی فرد ہونے سے مختلف ہے۔ یہ اختلاف وجودی یا ذاتی نہیں، سماجی ہے۔ سماج بھی محض مشرقی یا ایشیائی نہیں، عالمی ہے۔ مشرق ہو یا مغرب، عورت "ہاؤس وائف" ہو یا "پروفیشنل"، پردہ دار ہو یا بے حجاب، سہمی سہمی اور جھجکی جھجکی رہے یا خود اعتماد اور بے خوف ہو، سماج میں اس کی جگہ مرکز میں نہیں؛ حاشیے پر ہے۔ وہ نوعِ انسانی کی ایک ضمنی شے سمجھی جاتی ہے۔ یہ ایک ان کہی مگر مسلّمہ حقیقت بن چکی ہے کہ کائنات دراصل مرد کی جولاں گاہ ہے۔ عورت محض اس کی معاون، اس کی مددگار ہے۔ کارِ حیات کی ذمہ داری مرد پر ہے۔ عورت سے معاملہ کرنا بھی اسی کارِ حیات کا ایک جزو ہے۔ وہ کبھی طاقت کے ذریعے، کبھی پیار محبت سے، کبھی عزت دے کر، اپنے کارِ حیات میں عورت کو استعمال کرتا ہے۔4

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL

Vol.9. No.1.2026

ان کا یہ کہنا مبنی بر حقیقت ہے کہ سماج میں فرد ہونا ایک وجودی حیثیت ہے جو مرد کو بآسانی مل جاتی ہے لیکن عورت کے لیے یہی حیثیت سماجی اور تہذیبی ڈھانچے کے تناظر میں متنازع اور محدود بنادی گئی ہے۔ عورت کی سماجی حیثیت کو جب نجیبہ عارف نے عالمی منظر نامے پر دیکھا، جانا تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ کسی بھی معاشرے میں عورت کو فرد کی بجائے ایک حاشیائی کردار کے طور پر برتا جاتا ہے۔

مصنفہ کو بطور عورت خود پر اعتماد ہے اور اپنے آپ کو ایک مکمل انسان کے طور پر تسلیم کرتی ہیں۔ وہ خود کو تصویر کا رنگ نہیں بلکہ خود تصویر سمجھتی ہیں۔ یہاں وہ اس تصور کو رد کرتی ہیں کہ عورت ایک "ضمنی نوع" ہے یا مرد کی تکمیل کے بغیر نامکمل ہے۔ وہ کہتی ہیں۔

> بحیثیت ایک عورت میرا وجودی تجربہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ مجھے تصویرِ کائنات میں رنگ بھرنے سے کوئی دل چسپی ہے نہ رنگ ہونے کا یقین ہے۔ میں خود تصویر ہوں۔ میں خود کو ایک ضمنی نوع تصور نہیں کرتی۔ کر ہی نہیں سکتی کیوں کہ میری ذات مجھے یقین دلاتی ہے کہ میں اپنے آپ میں مکمل انسان ہوں۔ یہ کائنات میری بھی اتنی ہی جولاں گاہ ہے، جتنی کسی دوسری نوع کی۔ اس یقین نے مجھے یہ اطمینان بخشا ہے، اسے سماجی سطح پر قبولیت حاصل ہو یا نہ ہو، میرے لیے یہ بات بہت اہم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں کسی کو اپنا مدِ مقابل سمجھتی ہوں، نہ حریف، نہ رقیب۔ مجھے کسی دوسرے کا روپ دھارنے یا اس کے میدانِ عمل میں کود کر خود کو اس جیسا ثابت کرنے کی خواہش نہیں۔ میرے لیے میرا عورت ہونا اتنا ہی فطری ہے جتنا میرا انسان ہونا۔ مجھے اس بات سے کوئی کمی یا شکایت محسوس نہیں ہوتی۔ 5

اگرچہ وجودی سطح پر مصنفہ کو اپنی مکمل انسانیت کا یقین ہے، لیکن سماجی سطح پر انہیں قدم قدم پر اپنی ضمنی حیثیت اور تماشا ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ان کے ذاتی یقین اور سماج کی مسلط کردہ حقیقت کے درمیان کشمکش پیدا ہوتی ہے۔ یہی کشمکش ان کے اندرونی کرب اور اذیت کی جڑ ہے۔ وہ کہتی ہیں۔

> لیکن دوسری طرف یہ بھی سچ ہے کہ یہ تسکین اور اطمینان محض وجودی سطح پر ہے۔ سماج میں قدم قدم پر، ہر سانس کے ساتھ مجھے اپنی ضمنی حیثیت کا احساس ہوتا ہے۔ صرف ضمنی حیثیت کا ہی نہیں بلکہ ایک تماشا ہونے کا احساس۔ ایسا تماشا، جس کے چاروں طرف تماشائی ہیں۔ آنکھوں کے اس ہجوم میں، میری زندگی اپنی تنہائی کے تقدس سے محروم ہو گئی ہے۔ وجودی اور سماجی تجربے کا یہ بُعد میرے لیے اذیت ناک ہے۔ اس اذیت کا احساس میرے ہر تخلیقی تجربے کی تہہ میں موجود ہے۔ یہ ایک ایسا کرب ہے جس کا علم، احساس یا تجربہ اس کائنات میں میرے نوعی شریک، یعنی مرد کو نہیں ہو سکتا۔ حالاں کہ کائنات کے سب مسئلے اتنے ہی عورت کے ہیں جتنے مرد کے۔ زندگی کے تمام اَن بوجھے، اَن جانے، لاینحل سوال، وجود اور سماج کے سبھی دکھ سکھ، سبھی محرومیاں، سبھی کمیاں کوتاہیاں، سبھی بوجھ اتنے ہی عورت کے حصے میں آتے ہیں جتنے مرد کے۔ مگر یہ ایک اضافی بوجھ ہے جو صرف عورت کے کندھے پر ہے۔ اسے سمجھنا اور تسلیم کرنا تو کجا، کوئی اور اسے جان بھی نہیں سکتا۔ 6

عورت پر وہ تمام بوجھ بھی آتے ہیں جو مرد کو سہنے پڑتے ہیں۔ زندگی کی مشکلات، محرومیاں، دکھ سکھ، لیکن اس کے ساتھ ہی عورت کو ایک اضافی بوجھ بھی اٹھانا پڑتا ہے، یعنی اپنی حاشیائی حیثیت اور مسلسل معاشرتی نگرانی کا بوجھ۔ یہی بوجھ اسے مرد سے الگ اور مختلف تجربے کا حامل بنا دیتا ہے۔ اقتباس میں عورت کی داخلی خوداعتمادی اور سماجی محرومی کے درمیان موجود کشمکش کو بڑی شدت اور سچائی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ عورت وجودی سطح پر مکمل انسان ہے، مگر سماج اسے تماشائی آنکھوں کے ہجوم میں حاشیے پر دھکیل دیتا ہے۔ یہی تضاد اس کی تخلیق، اس کی حساسیت اور اس کے کرب کا سرچشمہ ہے۔

ان کے افسانے عورت کی داخلی دنیا، اس کے احساسات، خوابوں اور شکستگی کے ایسے پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں جو عموماً سماجی بیانیے میں دب کر رہ جاتے ہیں۔ ان کے ہاں عورت صرف ایک سماجی کردار نہیں بلکہ احساسات، خواہشات، شکستگی اور مزاحمت کا زندہ وجود ہے، جو اپنی شناخت اور معنویت کی تلاش میں مسلسل جدوجہد کرتی ہے۔ ان کے

افسانوں میں عورت کے احساسات نہ تو یک رخی ہیں اور نہ ہی سطحی بلکہ وہ تہ در تہ نفسیاتی کیفیات میں ڈوبی ہوئی ہیں، جہاں محبت، خوف، محرومی، تنہائی، خود کلامی اور احتجاج سب ایک ساتھ موجود ہوتے ہیں۔

نجیبہ عارف کے ہاں عورت کا وجودی کرب اس وقت نمایاں ہوتا ہے جب وہ خود کو ایک ایسی دنیا میں پاتی ہے جو اس کی ذات کو سمجھنے کے بجائے اس پر معنی اور حدود مسلط کرتی ہے۔ سماج کی روایتی اقدار، رشتوں کی پیچیدگیاں اور ذات کے اندرونی تضادات عورت کو ایک ایسے مقام پر لے آتے ہیں جہاں زندگی اور وجود کے بنیادی سوالات اسے گھیر لیتے ہیں، میں کون ہوں؟ میری پہچان کیا ہے؟ میری خواہشات اور خواب کیوں نامکمل رہ جاتے ہیں؟

ان کے افسانے عورت کے اس کرب کو نہ صرف جذباتی بلکہ فلسفیانہ اور نفسیاتی جہت میں بھی سامنے لاتے ہیں۔ وہ دکھاتی ہیں کہ عورت کے احساسات صرف ذاتی سطح تک محدود نہیں رہتے بلکہ سماجی ساخت، طاقت کے رشتے اور وجودی تنہائی سے گہرے طور پر جڑے ہوتے ہیں۔ نجیبہ عارف کے افسانوں میں تصورِ عورت کے حوالے سے شہناز نقوی کہتی ہیں۔

" ان میں ایک ترتیب ہے، خواتین کے حقوق، ان کے صبر واستقامت، مرد کے برابر عقل وشعور کی بات اور بیداری کی لہر، سماج میں مکمل کردار ادا کرتی عورت کی بات۔۔۔"7

نجیبہ عارف کے افسانوں میں ملازمت پیشہ عورت محض ایک سماجی کردار نہیں بلکہ ایک ایسا وجود ہے جو پدرشاہی دباؤ، جذباتی محنت اور داخلی کشمکش کے درمیان اپنی شناخت کی بازیافت کی مسلسل جدوجہد میں مصروف نظر آتا ہے۔ جدید اردو افسانہ نگاری میں عورت کے مسائل کو مختلف زاویوں سے پیش کیا گیا ہے، تاہم نجیبہ عارف کا اسلوب اس لحاظ سے منفرد ہے کہ وہ عورت کے خارجی مسائل کے ساتھ ساتھ اس کے باطن میں جاری کشمکش کو بھی نہایت باریکی سے اجاگر کرتی ہیں۔

ان کے افسانوں میں عورت ایک ایسی ہستی کے طور پر سامنے آتی ہے جو بیک وقت کئی محاذوں پر نبرد آزما ہے۔ ایک طرف وہ گھر اور خاندان کی ذمہ داریوں کو نبھاتی ہے اور دوسری طرف پیشہ ورانہ زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ مگر اس تمام جدوجہد کے باوجود وہ نہ مکمل طور پر ایک مثالی ماں بن پاتی ہے، نہ ایک مثالی بیوی، اور نہ ہی ایک مکمل پیشہ ور فرد۔ یہی ادھوراپن اس کے وجودی بحران کو جنم دیتا ہے اور یہی داخلی وخارجی کشمکش اکیسویں صدی کے اردو افسانے کا ایک نمایاں وصف بن چکا ہے۔

عورت کا نوکری کرنا زیادہ تر اس کی منشا کے برخلاف، مجبوری کے تحت ہوتا ہے۔ وہ گھر رہ کر گھرداری اور بچوں کی اچھی پرورش کرنا چاہتی ہے مگر سماجی ضرورتیں اسے نوکری کے لیے باہر نکلنے پر مجبور کر دیتی ہیں جس کی وجہ سے اس پر دوہری ذمہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں۔ افسانہ "ادھوراخط" بھی ایسی ہی عورت کی کہانی ہے جو دفتر میں کام کرتی ہے۔ یہاں مصنفہ عورت کی داخلی کشمکش اور وجودی اضطراب کو موضوع بناتے ہوئے لکھتی ہیں۔

جانتے ہو، مجھے ہر روز دفتر جانا کتنا برا لگتا تھا، ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے میں اپنے بچوں اور گھر والوں کی حق تلفی کر رہی ہوں، ان کے حصے کا وقت کسی اور کو دے رہی ہوں۔ لاکھ خود کو سمجھاتی تھی کہ جو کام میں کر رہی ہوں، وہ ایک قومی خدمت ہے، بلکہ انسانیت کی خدمت ہے، اس سے معاشرے میں علم کی روشنی پھیلے گی، جہالت کے اندھیرے دور ہوں گے، سب سے بڑھ کر یہ کہ نوکری رزق کا وسیلہ ہے، وغیرہ، وغیرہ۔ لیکن اندر ہی اندر مجھے احساسِ جرم ستاتا رہتا تھا۔ میں خود کو اندر سے کم ہوتا دیکھتی رہتی تھی۔ یہی خیال آتا تھا کہ کبھی وقت ہو۔۔۔ بہت سا وقت ہو۔ کوئی کام نہ کرنا ہو۔ کہیں جانے کی مجبوری نہ ہو۔8

یہاں عورت کا کردار نوکری کی وجہ سے احساسِ جرم کی کیفیت سے دوچار ہے، جو محض ذاتی نہیں بلکہ سماجی ساخت کی پیداوار ہے۔ دفتر جانا، نوکری کرنا اور ایک قومی خدمت کا حصہ ہونا بظاہر مثبت اور باوقار عمل ہے، مگر اس کے باوجود عورت کا اپنے ہی عمل سے شرمندہ ہونا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ سماج نے عورت کی اصل شناخت کو گھر، بچوں اور خاندان کے ساتھ اس حد تک جوڑ دیا ہے کہ اس سے ہٹ کر ہر انتخاب اسے حق تلفی محسوس ہونے لگتا ہے۔

افسانہ نگار ایک خط کے ذریعے اپنی دلی کیفیات کی عکاسی کر رہی ہیں۔ ان کا بار بار خود کو سمجھانے کی کوشش کرنا کہ یہ قومی خدمت، انسانیت کی خدمت اور رزق کا وسیلہ ہے، دراصل فرد کی داخلی کشمکش کو نمایاں کرتی ہے۔ یہ استدلالی جملے اس بات کا ثبوت ہیں کہ کردار اپنی ذات کو جواز فراہم کرنے پر مجبور ہے، گویا اس کا کام خود اس کے لیے کافی نہیں

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

بلکہ اسے مسلسل کسی بڑے اخلاقی یا سماجی بیانیے سے جوڑنا ضروری ہے۔ یہی کیفیت اکیسویں صدی کے اردو افسانے کے اس رجحان کی عکاس ہے جہاں تخلیقی ادب جمالیات سے آگے بڑھ کر انسان کے اپنی ذات کے سوالات کو موضوع بناتا ہے۔

یہاں عورت محض ایک ملازم یا ماں نہیں بلکہ ایک ایسا وجود ہے جو سماجی کرداروں کے بوجھ تلے اپنی ذات کو تحلیل ہوتا محسوس کرتا ہے۔ خود کو اپنے اندر کم ہوتا دیکھنا دراصل عورت کے وجودی بحران کو علامتی سطح پر پیش کرتا ہے۔ یہ وہی تصور ہے جسے نجیبہ عارف کے افسانوں میں عورت کی حیثیت سے جوڑا جا سکتا ہے کہ عورت ایک مکمل انسان ہے، مگر سماجی و تہذیبی نظام اسے ٹکڑوں میں بانٹ دیتا ہے۔ ماں، ملازمہ، بیوی اور ان ٹکڑوں کے بیچ اس کی فردی شناخت دب جاتی ہے۔

مصنفہ شخصی آزادی کی آرزو مند ہیں۔ ان کی یہ خواہش کہ کبھی کوئی کام نہ ہو اور وقت بھی ہو، گویا عورت کے اس بنیادی حق کی علامت ہے جسے سماج تسلیم نہیں کرتا یعنی اپنی ذات پر اختیار۔ مصنفہ کے یہ خیالات اس افسانوی تصور سے ہم آہنگ دکھائی دیتے ہیں جہاں تخلیقی ادب عورت کی شناخت گھڑنے کے بجائے اس کی ذات، سماج اور کائنات کے پیچیدہ رشتوں کو بے نقاب کرتا ہے اور عورت کے اس داخلی المیے کی نمائندگی بھی کرتا ہے جس میں وہ خود مختار وجود ہونے کے باوجود سماجی ساخت کے جبر کے تحت احساسِ جرم اور وجودی بے معنویت کا شکار ہو جاتی ہے۔

افسانہ نگار نے "ورکنگ وومن" میں بھی اسی طرح کے اپنے داخلی کرب کو موضوع بنایا ہے۔ یہ ایک ایسی عورت کی کہانی جو اپنی سسرال کی خواہش اور مرضی پر نوکری کر رہی ہے۔ مگر پھر بھی اسے گھر باہر ہر جگہ طعن و تشنیع کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ افسانہ نہایت باریکی سے اس داخلی کشمکش اور سماجی دباؤ کو سامنے لاتا ہے جو ایک کام کرنے والی عورت کی زندگی کا مستقل حصہ بن چکا ہے۔

> میں لکھنا چاہتی ہوں، مگر لکھ نہیں پاتی ہوں۔ ایک عجیب سا خوف، ایک عجیب سی رکاوٹ مجھے جکڑ لیتی ہے۔ میرا ذہن ماؤف ہونے لگتا ہے، کانوں میں شائیں شائیں ہونے لگتی ہے۔ لفظ ذہن سے یوں بھاگ کھڑے ہوتے ہیں جیسے کسی نے خطرے کا سائرن بجا دیا ہو۔ وہ ساری باتیں جو چلتے پھرتے، سوتے جاگتے دھیان میں آتی رہتی ہیں؛ میں سوچتی ہوں، ان پر تو افسانہ لکھا جانا چاہیے۔ پھر افسانے کی کڑیاں ملاتی ہوں، قصہ ترتیب دیتی ہوں، کردار گھڑتی ہوں اور سوچتی ہوں۔ لیجیے بھئ ،افسانہ تیار ہو گیا۔ اک ذرا سی فرصت ملنے کی دیر ہے۔9

مصنفہ یہاں تخلیقی عمل کے اس نازک اور کرب ناک مرحلے کو نمایاں کرتی ہیں جہاں لکھنے کی خواہش اور لکھ نہ پانے کی کیفیت آمنے سامنے آ کھڑی ہوتی ہیں۔ یہ محض تخلیقی جمود نہیں بلکہ ایک گہرا نفسیاتی، وجودی اور سماجی مسئلہ ہے، جسے اکیسویں صدی کے اردو افسانے کے فکری تناظر میں بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ خوف اور رکاوٹ کی تکرار اس کیفیت کو غیر واضح مگر شدید بناتی ہے۔ یہ خوف کسی بیرونی پابندی کا نہیں بلکہ اندرونی جبر کا نتیجہ ہے۔ ذہن کا ''ماؤف'' ہونا اور کانوں میں ''شائیں شائیں'' دراصل اس دباؤ کی علامت ہیں جو تخلیق کار کے لاشعور پر سماجی توقعات، خود احتسابی اور ناکامی کے اندیشے کی صورت میں مسلط ہو چکا ہے۔ یوں تخلیق ایک آزاد عمل کے بجائے ذہنی اذیت میں بدل جاتی ہے۔ لفظوں کا ''خطرے کا سائرن سن کر بھاگ کھڑا ہونا'' نہایت بامعنی استعارہ ہے۔ یہاں لفظ، جو تخلیق کا بنیادی وسیلہ ہیں، خود عدم تحفظ کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔ اس سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ لکھنے والا فرد اپنے ہی تخلیقی اظہار سے خوفزدہ ہے۔ گویا سچ لکھ دینا، ذات کو عریاں کر دینا، یا سماج کے سامنے اپنا باطن رکھ دینا ایک خطرناک عمل بن چکا ہے۔ یہ کیفیت نجیبہ عارف کے افسانوی وژن سے ہم آہنگ ہے، جہاں ذات کی دریافت آسان نہیں بلکہ ایک تکلیف دہ عمل ہے۔

> ہر وقت یہ خیال ذہن کو کچوکے لگاتا رہتا ہے کہ مجھے کچھ لکھنا چاہیے تھا جو ابھی تک نہیں لکھا۔
> لیکن ایک بات اور بھی ہے۔ یہ خیال جو کچوکے لگاتا ہے، صرف لکھنے سے متعلق نہیں ہے۔ زندگی کے ہر معاملے میں پورے نہ پڑنے کا احساس ہر وقت اندر اندر ہی جیسے کھدیڑتا، ادھیڑتا رہتا ہے۔10

یہ اقتباس اکیسویں صدی کے اردو افسانے کے اس رجحان کی نمائندگی کرتا ہے جہاں تخلیق کا عمل خود موضوع بن جاتا ہے۔ یہ عورت کے اس وجودی المیے کو سامنے لاتا ہے جس میں وہ سوچ سکتی ہے، محسوس کر سکتی ہے، تخلیق کر سکتی ہے—مگر لکھنے کے لمحے میں سماج، خوف اور ذات کا بوجھ اس کے ہاتھ روک لیتا ہے۔ یہی وہ داخلی کشمکش ہے جو جدید اردو افسانے کو محض کہانی نہیں بلکہ فکری اور وجودی دستاویز بنا دیتی ہے۔

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

نجیبہ عارف کے افسانے عورت کو روایتی بیانیے کے تحت مظلوم یا ثانوی کردار کے طور پر نہیں بلکہ ایک خود مختار، باشعور اور مکمل وجود کے طور پر پیش کرتے ہیں، جو سماجی ساخت اور تہذیبی نظام کی تحدیدات کے اندر اپنی شناخت اور معنویت کی تلاش میں مصروف ہے۔ اس مطالعے کے ذریعے یہ بھی آشکار ہوتا ہے کہ نجیبہ عارف کا تخلیقی ادب ذات، سماج اور کائنات کے باہمی رشتوں کی فکری دریافت کا عمل ہے، جو فرد کے وجودی سوالات اور داخلی کشمکش کو افسانوی بیانیے میں منتقل کرتا ہے۔

افسانہ "ورکنگ وومن" ایک عورت کی سماجی، نفسیاتی اور معاشی کشمکش کو نہایت مؤثر اور حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کرتا ہے۔ یہ محض ایک عورت کی کہانی نہیں بلکہ پورے معاشرے میں کام کرنے والی عورت کے اجتماعی تجربے کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس میں مصنفہ نے عورت کے اُس داخلی کرب کو آشکار کیا ہے جو بیک وقت ماں، بیوی اور پیشہ ور فرد ہونے کی ذمہ داریوں کے درمیان پِس رہا ہوتا ہے۔

یہاں عورت کی نوکری کو انتخاب کی بجائے مجبوری کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ بعض اوقات گھریلو حالات اور بعض اوقات سسرال کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اسے نوکری کا بوجھ اٹھانا پڑتا ہے۔ اس افسانے میں بھی مصنفہ اپنے سسرال کے اصرار پر نوکری کرنے پر مجبور ہوتی ہیں جن کا مؤقف ہے کہ تعلیم سے فائدہ اٹھانا چاہیے، اور عورت کا گھر میں بیٹھے رہنا نہ صرف اسے بور کرتا ہے بلکہ اس کی شخصیت پر بھی منفی اثر ڈالتا ہے۔ سسرال کی یہ خواہش ہمارے معاشرے کے اس تضاد کو ظاہر کرتی ہے کہ ایک طرف عورت کی تعلیم کو سراہا جاتا ہے، مگر دوسری طرف اس کی عملی زندگی کو سماجی دباؤ اور توقعات کے تابع کر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ مصنفہ کی خواہش اپنے بچوں کو زیادہ وقت دینے کی ہوتی ہے۔ افسانہ "ورکنگ وومن" میں کہتی ہیں۔

> بچوں کو پاس بلاؤں کہ دو گھڑی آ کر بیٹھ جاؤ تو وہ فوراً کہتے ہیں، یاد ہے، جب ہم چھوٹے تھے اور کہتے تھے، آپ ہمیں چھوڑ کر دفتر نہ جائیں، ہمارے پاس بیٹھی رہیں، تو آپ دوپٹے کا پلو چھڑا کر چل دیتی تھیں۔
>
> میں انھیں بتا نہیں پاتی کہ اس پلو سے، جو تمھارے ننھے ننھے ہاتھوں سے چھڑایا ہوتا، راستہ بھر آنکھوں کے گوشے رگڑتی جاتی تھی، پھر دفتر کے گیٹ میں داخل ہونے سے پہلے رک کر کاجل کی لکیر ٹھیک کرتی اور چہرے پر مستعدی مسکراہٹ سجا کر دفتر میں داخل ہو جاتی تھی۔ قدم تیز تیز اٹھتے تھے مگر دل کتنا بھاری ہوتا تھا۔ اس دل کے منہ پر مسلسل ہاتھ رکھنا پڑتا تھا تاکہ اندر والی آواز۔۔۔11

یہاں دوپٹہ محض ایک علامت نہیں بلکہ مادری رشتے کی جذباتی وابستگی کا استعارہ ہے۔ مصنفہ نے بڑی مہارت سے دوپٹے کی علامت کے ذریعے عورت کے اندرونی دکھ کو ظاہر کیا ہے۔ بچوں کے ساتھ اس کا مکالمہ دراصل عورت کے باطن میں چلنے والی مسلسل کشمکش کی علامت ہے۔ وہ بچوں کو چھوڑ کر دفتر جاتی ہے، مگر اس کا دل اسی دوپٹے کے پلو سے بندھا رہتا ہے۔ گویا نوکری کرنے والی ماں یہاں نفسیاتی سطح پر احساسِ جرم میں مبتلا ہے، جبکہ اس کے ساتھ ساتھ عورت دفتر میں الگ سے سماجی دباؤ کا سامنا کرتی ہے۔

> سب مرد ساتھی مذاق اڑاتے تھے:
>
> یہ عورتیں ـــــ انھیں تو کبھی کوئی انتظامی ذمہ داری نہیں دینی چاہیے۔ کسی شعبے کا انچارج نہیں بنانا چاہیے۔ یہ تو بس بچے پالنے کی فکر میں مبتلا رہتی ہیں۔ ہر وقت کا رونا۔۔۔ آج بچہ بیمار ہے، آج ساس کی طبیعت خراب ہے، آج برتن دھونے والی ماسی نہیں آئی۔ پروفیشنل ازم تو ان میں نام کو نہیں ہوتا۔
>
> جی تو بہت چاہتا ہے کسی روز ان کے دفتری اوقات کا ٹائم ٹیبل بنا کر انھیں دکھا دیں۔ انھیں بتائیں کہ یہ ہم عورتیں ہی ہیں جو صبح سے شام تک اپنی اپنی کرسیوں سے چپکی بیٹھی رہتی ہیں۔ نہ سگریٹ کا وقفہ، نہ دوستوں کی آمد، نہ نماز کے بہانے گھنٹے بھر کی چھٹی۔ مگر کون ان کی مکالفت مول لے۔ ایسی ایسی تہمت لگاتے ہیں کہ گھر جانے کے لائق بھی نہیں چھوڑتے۔
>
> وہ تو شکر ہے کہ میرے میاں بہت اچھے ہیں۔ ہر طرح سے میرا خیال رکھتے ہیں۔ حکم نہیں چلاتے۔ دھیمے مزاج کے ہیں ۔ میٹھا میٹھا بولتے ہیں۔ ورنہ تو گھر جاتے ہی عورتوں کے نئے سرے سے ڈیوٹی آورز شروع ہو جاتے ہیں۔12

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

یہاں مرد ساتھیوں کے طنزیہ اور تحقیر آمیز جملے دراصل پدرشاہی ذہنیت کی عکاسی کرتے ہیں، جہاں عورت کی پیشہ ورانہ صلاحیت کو اس کی گھریلو ذمہ داریوں کے تناظر میں کم تر سمجھا جاتا ہے جو کہ ملازمت پیشہ خواتین کی ذہنی اور جسمانی صحت کو متاثر کرنے کا باعث بنتا ہے۔[13] اقتباس میں ان کا یہ کہنا "یہ عورتیں" ایک عمومی سماجی رویے کو ظاہر کرتا ہے نہ کہ کسی ایک فرد کی رائے کو۔ اس طرح افسانہ فرد سے نکل کر پورے سماجی ڈھانچے پر تنقید بن جاتا ہے۔

یہ مسئلہ صرف دفتر اور بچوں تک محدود نہیں رہتا بلکہ عورت کو گھریلو رشتوں میں بھی مختلف رویّوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ نند اور ساس کے تبصرے اس کی جدوجہد کو سمجھنے کے بجائے اسے ایک آسودہ زندگی کا حامل ظاہر کرتے ہیں۔ نند کا کہنا ہے۔

> ہمارے بھائی نے تو بھابھی کو ہاتھ کے چھالے کی طرح رکھا ہے۔ گھر میں نوکروں کی ریل پیل ہے۔ کھانے پینے، پہننے اوڑھنے کی کوئی پابندی نہیں۔ دفتری دوروں پر ملکوں ملکوں گھومتی ہیں۔ اپنا کریڈٹ کارڈ بھابھی کو دے رکھا ہے۔ ساری شاپنگ وہ اسی کارڈ سے کرتی ہیں۔14

اور ساس کا کہنا۔ قدر کیا کرو لڑکی! ایسا شوہر نصیبوں والیوں کو ملتا ہے۔[15]

یہاں عورت کے کردار میں دوہری محنت کا تصور نمایاں ہے۔ دفتر میں پیشہ ورانہ ذمہ داریاں نبھانے کے بعد گھر آ کر گھریلو فرائض انجام دینا، اس کے لیے ایک مسلسل مشقت ہے۔ جدید سماج میں ملازمت پیشہ عورت کو جس 'دوہرے بوجھ' کا سامنا ہے، وہ صرف معاشی ذمہ داری تک محدود نہیں بلکہ گھریلو فرائض اور پیشہ ورانہ تقاضوں کے درمیان مسلسل توازن قائم رکھنے کی جدوجہد ہے۔ مغربی سماجی نظریات کے مطابق عورت کے لیے گھر کے اندر کی ذمہ داریوں کو بنیادی، اور گھر سے باہر کی سرگرمیوں کو ثانوی حیثیت دی جاتی ہے، جس کے باعث کل وقتی ملازمت کرنے والی عورت بیک وقت دو محاذوں پر اپنی صلاحیتیں صرف کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ یہی صورتِ حال نجیبہ عارف کہ کہانیوں میں بھی نمایاں نظر آتی ہے جن میں وہ عورت کی داخلی کشمکش، سماجی توقعات اور پدرشاہی رویّوں کو موضوع بناتی ہیں۔ ان کے نزدیک عورت اگر معاشی خود مختاری حاصل بھی کر لے تب بھی معاشرہ اسے روایتی گھریلو ذمہ داریوں سے آزاد نہیں کرتا، نتیجتاً وہ نفسیاتی دباؤ، تھکن اور شناختی بحران کا شکار رہتی ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق

> For women, it is perceived that being “inside the home” is prioritized primarily and being “outside the home” is prioritized secondarily, which brings about a “double burden” for full-time working mothers.16

اگرچہ یہاں شوہر کا کردار مثبت دکھایا گیا ہے، مگر مجموعی نظام پھر بھی عورت پر بوجھ ڈالنے والا ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انفرادی اچھائی بھی ساختی ناانصافی کو مکمل طور پر ختم نہیں کر سکتی۔ مزید برآں، شوہر کے جملے ایک اور نفسیاتی دباؤ کو جنم دیتے ہیں۔ جب وہ کہتے۔

> وہ جو رضوانہ ہے نا، ہماری اکاؤنٹنٹ، بہت ماڈرن سی، مگر شادی نہیں کی، آج کہہ رہی تھی، 'اگر مجھے آپ جیسا شخص مل جائے تو شادی میں ذرا دیر نہ لگاؤں۔'
>
> صبیحہ اکثر کہتی ہے، 'بھٹی صاحب! آپ ایک آئیڈیل انسان ہیں۔ سچ پوچھیں تو مجھے آپ جیسا مرد پہلے کبھی نظر نہیں آیا۔ کتنے کیئرنگ ہیں آپ!'
>
> اور شہلا تو میری اس قدر گرویدہ ہے کہ کوئی فیصلہ مجھ سے پوچھے بغیر نہیں کرتی، کہتی ہے، 'میرے دل میں آپ کی محبت اور احترام ہمیشہ رہے گا۔ مرتے دم تک۔'
>
> "کیسے ہیں اب آپ؟ آج آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی؟ بھابھی نے سوپ بنا کر دیا یا نہیں؟ مگر وہ تو خود مصروف ہوتی ہیں۔ انھیں کہاں وقت ملا ہو گا۔ اچھا، کل میں آپ کے لیے سوپ بنا کر لاؤں گی۔"17

اگرچہ وہ براہِ راست تنقید نہیں کرتا، مگر دیگر خواتین کے حوالے سے دیے گئے یہ تبصرے جیسے رضوانہ، صبیحہ، شہلا وغیرہ کی تعریف، بیوی کے ذہن میں غیر محسوس انداز میں احساسِ کم تری اور عدمِ اطمینان پیدا کرتے ہیں۔ اس طرح شوہر کا بظاہر مثبت کردار بھی لاشعوری طور پر ایک ایسا ماحول تشکیل دیتا ہے جہاں عورت خود کو مسلسل جانچتی اور کمتر

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
Vol.9. No.1.2026

محسوس کرتی رہتی ہے۔ اور پھر فیس بک پر ایک اور عورت سے گفتگو جس پر بیوی کی نظر پڑ جاتی ہے اسے ایک نئے نفسیاتی دباؤ میں گھیر لیتی ہے اور اس کے اندر ایک گہری احساسِ ناکافیت اور تقابلی فضا کو جنم دیتا ہے۔

"میری بیگم صاحبہ تو اس وقت بھی دفتر کے کاموں میں مصروف ہیں۔ دراصل ان کی نوکری ہی ایسی ہے، گھر میں بھی کام کرنا پڑتا ہے۔ میں انھیں ڈسٹرب نہیں کرتا۔ زندگی تو آپ کے میاں کی ہے۔ کتنا خیال رکھتی ہیں آپ ان کا۔"18

شوہر کا یہ جملہ بظاہر بیوی کے پیشہ ورانہ مصروفیات کا اعتراف معلوم ہوتا ہے، مگر اس کے اندر ایک گہرا طنز اور تقابلی رویہ پوشیدہ ہے۔ بیوی، جو پہلے ہی گھر اور دفتر کی دوہری ذمہ داریوں میں الجھی ہوئی ہے، اب خود کو ایک ایسی عورت کے طور پر دیکھنے لگتی ہے جو نہ مکمل ماں بن پا رہی ہے، نہ مثالی بیوی۔ اس کے برعکس دوسری خواتین کا فرصت یافتہ اور خدمت گزار رویہ اس کے لیے ایک خاموش مقابلہ کی فضا پیدا کرتا ہے۔

تنقیدی نقطۂ نظر سے یہ رویہ نرم پدرشاہی کی مثال ہے، جہاں براہِ راست جبر یا حکم نہیں ہوتا، مگر جملوں اور رویّوں کے ذریعے عورت کو احساس دلایا جاتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی سطح پر کم ہے۔ اس طرح شوہر کا کردار بظاہر معاون ہونے کے باوجود لاشعوری طور پر اسی سماجی ڈھانچے کو تقویت دیتا ہے جو عورت کو مسلسل احساسِ جرم اور ناکافیت میں مبتلا رکھتا ہے۔ اس تناظر میں ڈاکٹر مبارک کی رائے نہایت معنی خیز معلوم ہوتی ہے۔

یہ کہنا صحیح نہیں کہ عورت کی اپنی شخصیت ختم ہو گئی، اور اس نے خود کو مرد کی ذات میں ضم کر دیا۔ نہیں اس کی اپنی ذات اور وجود برقرار رہتا ہے، مگر چھپا ہوا۔ کئی تہوں کے نیچے وہ مرد کی بنائی ہوئی روایات، اقدار اور اداروں کے درمیان کھوئی ہوئی اور گم شدہ ذات ہے۔19

یہی تصور افسانے کے اختتام پر پوری شدت کے ساتھ ابھرتا ہے۔ مصنفہ کے آخری الفاظ پورے بیانیے کا نچوڑ محسوس ہوتے ہیں، جہاں ملازمت پیشہ عورت کا داخلی کرب اور وجودی تھکن اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ بظاہر وہ ایک فعال، ذمہ دار اور کامیاب کردار ہے، مگر اس کی اصل ذات، اس کی خواہشات اور اس کی داخلی آواز مسلسل دبتی اور پس منظر میں چلی جاتی ہے۔ یوں افسانہ اس حقیقت کو نہایت مؤثر انداز میں اجاگر کرتا ہے کہ عورت کی شناخت مٹتی نہیں، بلکہ سماجی دباؤ کے نیچے دب کر ایک خاموش وجود میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

میری ساری دوڑ بھاگ، ساری تگ و دو، ساری مشقت ایک پل میں ریت کا ڈھیر بن جاتی ہے۔ بس ایک پچھتاوا سا لگ جاتا ہے۔ جی چاہتا ہے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں دُور بھاگ جاؤں۔
گھر سے، دفتر سے، خود سے---ہر شے سے دُور۔
مگر اتنی دُور کوئی جگہ ہی نہیں ہے۔ ہو بھی تو جاؤں کیسے---؟
بس اٹھ کر اپنی اسٹڈی میں آ جاتی ہوں اور لیپ ٹاپ کھول کر گود میں رکھ لیتی ہوں۔ لیمپ روشن کر کے خود پر جھکا لیتی ہوں اور سوچتی ہوں کہ کچھ لکھوں مگر کچھ لکھا ہی نہیں جاتا۔
اب اتنی سی بات پر کہانی تو نہیں بنتی نا---!20

عورت کی تمام تر جدوجہد گھر، دفتر اور رشتوں کے درمیان مسلسل تگ و دو ایک لمحے میں "ریت کا ڈھیر" بن جانا، ایک نہایت بامعنی استعارہ ہے، جو اس کی محنت کے لاحاصل پن اور داخلی ٹوٹ پھوٹ کو ظاہر کرتا ہے۔ پچھتاوا دراصل اسی احساسِ جرم اور ناکافیت کا تسلسل ہے جو پورے افسانے میں اس کے کردار کے ساتھ جڑا رہتا ہے۔ ایسے ماحول میں عورت کا گھر، دفتر، خود اور ہر شے سے دور بھاگ جانے کی خواہش کرنا اس کے شدید نفسیاتی دباؤ کو ظاہر کرتا ہے، مگر فوراً ہی اس خواہش کی نفی بھی سامنے آتی ہے۔ یہ اس حقیقت کی علامت ہے کہ وہ جہاں بھی جائے گی، اسی نوعیت کے مسائل اور رویّے اس کا پیچھا کریں گے۔ یوں فرار کی کوئی حقیقی صورت باقی نہیں رہتی اور مسئلہ خارجی دنیا سے بڑھ کر اس کے وجود کا حصہ بن جاتا ہے۔

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

چنانچہ وہ ایک علامتی فرار اختیار کرتی ہے۔ اسٹڈی میں جاکر لیمپ کی روشنی میں لیپ ٹاپ کھولتی ہے اور کچھ لکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ مگر یہاں بھی تخلیقی عمل ممکن نہیں ہو پاتا، جو اس کی گہری مایوسی اور ذہنی جمود کی علامت ہے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ اگر وہ لکھے بھی تو اس سے نہ تو کوئی نظام بدلنے والا ہے اور نہ ہی اس کے مسائل کا حل نکلنے والا ہے۔ لہٰذا اس کا یہ کہنا کہ "اب اتنی سی بات پر کہانی تو نہیں بنتی نا" بظاہر یہ ایک معمولی بات معلوم ہوتی ہے، مگر حقیقت میں یہی "اتنی سی بات" ایک بڑے سماجی المیے کی نمائندگی کر رہی ہوتی ہے۔ اس طرح یہ جملہ نہ صرف ایک داخلی خود کلامی ہے بلکہ پورے معاشرے کی بے حسی، عدمِ ادراک اور عورت کی جدوجہد سے لاتعلقی پر ایک خاموش مگر گہرا طنز بھی ہے۔

افسانے کے آغاز میں بھی مصنفہ اسی داخلی کشمکش کا شکار نظر آتی ہیں۔ بظاہر موضوعات کی کوئی کمی نہیں، کہانیوں کی ایک پوری قطار موجود ہے اور تخلیق کا عمل بھی ناممکن نہیں، مگر اس کے باوجود وہ لکھ نہیں پاتی۔ ایسی مایوسی لاحق ہے جہاں تخلیق کا عمل بے اثر محسوس ہونے لگتا ہے۔ یہ کیفیت محض تخلیقی رکاوٹ نہیں بلکہ ایک گہری نفسیاتی اور وجودی بے معنویت کی علامت ہے۔

> افسانہ لکھنا ہے۔ موضوعات کی کوئی کمی نہیں۔ قطار لگی ہے۔ کہانیاں گھڑنا بھی کیا مشکل ہے، گھڑ ہی لوں گی۔ مگر لکھا نہیں جاتا۔ ایسے لگتا ہے لکھ بھی لیا تو کیا ہو جائے گا؟ کیا اندر کا خلا بھر جائے گا؟ کیا باہر کی دنیا بدل جائے گی؟ مجھے معلوم ہے کچھ بھی ہونے والا نہیں ہے۔ پھر لکھنا اور نہ لکھنا۔۔۔ دونوں برابر ہیں۔ 21

تنقیدی طور پر یہ اقتباس افسانے کے مرکزی بیانیے سے گہرا ربط رکھتا ہے، جہاں ایک ملازمت پیشہ عورت کی زندگی محض خارجی ذمہ داریوں تک محدود نہیں رہتی بلکہ اس کا تخلیقی اور داخلی وجود بھی متاثر ہوتا ہے۔ آغاز اور اختتام دونوں مقامات پر یہی کیفیت دہرائی گئی ہے، جس سے ایک دائروی ساخت سامنے آتی ہے۔ جس سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ عورت کی کشمکش محض وقتی یا عارضی نہیں بلکہ ایک مسلسل اور ہمہ گیر عمل ہے، جس میں وہ بیک وقت سماجی، نفسیاتی اور وجودی دباؤ کا شکار رہتی ہے۔ یوں اس کا تخلیقی وجود بھی اسی جبر کے زیرِ اثر ماند پڑ جاتا ہے، اور اس کی آواز ایک ایسی خاموشی میں بدل جاتی ہے جو خود ایک معنی خیز بیانیہ بن جاتی ہے۔

ایسا نہیں کہ مصنفہ خود بھی ملازمت پیشہ ہونے کے ناطے صرف ملازمت پیشہ عورت کے سماجی اور نفسیاتی مسائل سے آگاہ ہیں اور انھیں اپنی کہانیوں کا موضوع بناتی ہیں، بلکہ ایک عورت ہونے کے ناطے وہ گھریلو خواتین کے مسائل اور داخلی و خارجی کشمکش سے بھی بخوبی واقف ہیں اور انہیں اپنی افسانوی تخلیقات میں نمایاں انداز سے پیش کرتی ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے افسانے نہ صرف پیشہ ورانہ زندگی کی جدوجہد بلکہ گھریلو زندگی کی پیچیدگیوں اور اس کے وجودی اثرات کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔۔ "من مارنی" ایک ایسا ہی افسانہ ہے جس میں مصنفہ نے معروف افسانہ نگار خالدہ حسین کی جدوجہد کے نام کرتے ہوئے بڑی خوبصورتی سے ایک عورت کی زندگی بھر کی مشقت اور محنت پر خراجِ تحسین پیش کیا ہے جس میں خالدہ حسین کو مخاطب کرتے ہوئے دراصل تمام گھریلو خواتین کی جدوجہد، ٹوٹے ہوئے وجود اور اپنے کھوئے ہوئے حصوں کی تلاش کی بڑی عمدگی سے عکاسی کی ہے۔

> زندگی بھر تم اسی حصار، اسی حفاظتی جنگلے میں رہی تھیں، مگر تم نے بھی تو حد کر دی تھی۔ اس جنگلے کی سلاخوں میں سے جھانک جھانک کر دنیا کو تاکتی رہتی تھیں۔ اپنی بے چین آنکھوں سے ارد گرد پھرتے ہوئے انسانی وجودوں کو چیر کر ان کے اندر تک دیکھ لیتی تھیں۔۔۔ اپنی دید سے حظ اٹھاتی ہوئی آنکھیں۔۔۔ گونگی اور بے جان چیزوں سے باتیں کرتی ہوئی آنکھیں۔۔۔ دروازوں سے درختوں سے، راستوں سے، کمروں سے، سیڑھیوں سے۔۔۔ تمھیں ہم سب سے زیادہ دکھائی دیتا تھا، زیادہ سنائی دیتا تھا۔ گفتگو میں آنے والے وقفوں سے معنی نکال لینا تمھیں خوب آتا تھا۔ چہرے کے تیور تمھیں دل کی باتیں بتا جایا کرتے تھے۔۔۔ پتہ نہیں کیسے تم اتنا دیکھ لیتی تھیں، اتنا سن لیتی تھیں۔
>
> تمھارے اندر اترنے والے زینے بڑے پیچ دار تھے۔ ان پر قدم رکھتے ہی پھسل پڑنے کا اندیشہ ہوتا تھا۔۔۔ اپنی خلوت کے شب زاروں میں تم نے کتنی انوکھی دنیائیں بسا رکھی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں کو جان کر، چھو کر، معنی ڈھونڈ لینے اور

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

> خوش رہنے والی تمھاری عادت کیسی عجیب تھی۔ تمھاری اس سحر بھری دنیا میں کیسا تحیر، کیسے کیسے طلسمات تھے، کتنا ٹھہراؤ تھا، کتنا سکوت تھا، کتنی گہرائی تھی۔ مگر تمھارے اندر کتنا اضطراب، کتنی تلاش، کتنی تڑپ تھی۔22

افسانے میں خالدہ حسین کو مخاطب کرنے کا اسلوب دراصل ایک علامتی تخاطب ہے جس کے ذریعے فردِ واحد کی حیات گیر جدوجہد کو اجتماعی نسوانی تجربے میں ڈھال دیا گیا ہے۔ حصار اور حفاظتی جنگلے کی علامتیں بیک وقت تحفظ اور قید کے دوہرے مفہوم کو روشن کرتی ہیں، جہاں عورت محدود فضا میں رہتے ہوئے بھی اپنے شعور کی روشن آنکھ سے دنیا کو پرکھتی اور خاموشیوں سے معنی کشید کرتی ہے۔ باطن کی پیچ دار سیڑھیاں اس داخلی سفر کی دشواری اور خطرے کی نشان دہی کرتی ہیں جس میں سکوت اور اضطراب، ٹھہراؤ اور تڑپ ایک ساتھ موجزن رہتے ہیں۔ معمولی اشیا سے مکالمہ اور جزئیات سے معنی اخذ کرنے کی صلاحیت اس تخلیقی بصیرت کو نمایاں کرتی ہے جو دکھ اور تنہائی کو جمالیاتی تجربے میں بدل دیتی ہے۔ گویا عورت کے اندر بستی ہوئی بے نام جستجو، اس کی تخلیقی حساسیت اور اس کے وجودی کرب کو نہایت دل آویز ادبی پیرائے میں مؤثر انداز میں اجاگر کیا ہے۔ مبین مرزا اس حوالے سے رقمطراز ہیں۔

> "من مارنی "ایک بلیغ سماجی اور ادبی کردار ہے۔نام نہاد سماجی اقدار کے دائرے میں ہارتی ہوئی زندگی کو بامعنی بنانے کی کامیاب سعی کرنے والا ایک ایسا نسوانی کردار جو مردانہ جبر کے سامنے بظاہر سپر انداز ہے، لیکن دراصل اپنے وجود کی پسپائی کو طاقت میں تبدیل کرکے روح کی جیت کا سامان کرنے والا ہے۔"23

اس کردار میں شکست خوردگی اور مزاحمت کا جو امتزاج موجود ہے، وہ نہ صرف فرد کی نفسیاتی گہرائی کو ظاہر کرتا ہے بلکہ سماجی اور ادبی تناظر میں عورت کے مقام اور جدوجہد کو بھی مؤثر انداز میں اجاگر کرتا ہے۔ افسانے میں ایک اور جگہ لکھتی ہیں۔

> ہم آدھی عورتیں ہیں۔ ہمارا باقی آدھا گم شدہ ہے۔تم بھی اسے ڈھونڈتی رہیں۔ میں بھی اسے ڈھونڈنے میں مصروف ہوں ، تمھاری طرح مصروف عورت۔ اکیلے اکیلے ڈھونڈنا مشکل ہوتا ہے نا! تم ساتھ رہو تو۔۔۔شاید۔۔۔ کبھی۔۔۔24

خالدہ حسین نے بطور ادیب عورت کی معاشرے میں حاشیائی زندگی، محدود اختیارات اور سماجی چیلنجز کو موضوع بنایا۔ یہاں مصنفہ نے خالدہ حسین کے افسانوں "آدھی عورت" اور "مصروف عورت" کے عنوانات اس اقتباس میں ضم کرکے ایک نیا بیانیہ تخلیق کیا ہے جو عورت کی داخلی کشمکش، اس کی شناخت کی تلاش، اور اس تلاش میں باہمی تعاون کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔

"ہم آدھی عورتیں ہیں" جملہ اس احساس کی طرف توجہ مبذول کراتا ہے کہ ہم اپنی ذات سے کٹی ہوئی ہیں، ہم مکمل طور پر مردوں کی طرح ابھر نہیں پاتیں، سماجی دباؤ، رشتوں کی پیچیدگیوں، مردانہ بالادستی اور صنفی امتیازات اور اپنی ذات کو منوانے کی جنگ نے ہمیں ادھورا کر دیا ہے۔ پھر بھی ہمت نہیں ہاری اور ہم مسلسل اس کھوئے ہوئے وجود اور شناخت کو تلاش کرنے پر مصر ہیں جو ان سے چھین لیا گیا ہے۔ کیونکہ یہی زندگی ہے اور اپنے کھوئے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑنے کی مسلسل کوشش جاری ہے۔ یہاں ایک عورت دوسری عورت کے کرب کو محسوس کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ عورت کے لیے اکیلے اپنی تلاش کا سفر تھکا دینے والا ہے۔ وہ پہلے ہی گھر، خاندان اور سماج کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہے جو کہ مصروف عورت کے کھوئے ہوئے وجود کو ڈھونڈنے میں رکاوٹ بھی ہے اور ایک طرح سے تحریک بھی۔ چنانچہ عورت ہی عورت کو اجتماعی جدوجہد کی دعوت دیتی ہے کہ مل کر تلاش کرنے سے شاید ہماری کوشش کامیاب ہو جائے۔ دراصل یہ پدرشاہی نظام پر تنقید ہے جو عورت کو مکمل انسان ماننے سے انکاری ہے۔

مذکورہ تجزیے سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ نجیبہ عارف کے افسانوں میں ملازمت پیشہ عورت کی زندگی محض معاشی سرگرمی یا سماجی فعالیت تک محدود نہیں بلکہ ایک پیچیدہ داخلی کرب، نفسیاتی انتشار اور وجودی کشمکش کی علامت بن کر سامنے آتی ہے۔ بظاہر وہ ایک خود مختار، بااختیار اور ذمہ دار شخصیت دکھائی دیتی ہے، لیکن اس کے باطن میں احساسِ جرم، ناکافیّت، تھکن اور جذباتی تنہائی کی ایک مسلسل لہر موجزن رہتی ہے۔ افسانوں میں موجود مختلف سماجی و خاندانی رشتے—شوہر، بچے، ساس، نند اور دفتری ماحول—مل کر ایسا دباؤ پیدا کرتے ہیں جس کے نتیجے میں عورت کی شناخت تقسیم در تقسیم ہوتی چلی جاتی ہے۔ وہ ہر کردار کو مکمل طور پر نبھانے کی کوشش میں اپنی اصل ذات، خواہشات اور انفرادی

وجود سے دور ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ تخلیق اور اظہار جیسے باطنی اعمال بھی اس کے لیے سکون یا نجات کا وسیلہ نہیں بن پاتے، جو اس کے وجودی بحران کی شدت کو نمایاں کرتے ہیں۔

یوں نجیبہ عارف کی افسانہ نگاری صرف ملازمت پیشہ عورت کے مسائل کی عکاس نہیں بلکہ ایک وسیع تر سماجی اور تہذیبی بیانیے کی نمائندہ ہے، جہاں عورت کی جدوجہد، قربانی اور داخلی اذیت کو مکمل طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا۔ ان کے افسانے قاری کو اس امر پر سنجیدگی سے غور کرنے پر مجبور کرتے ہیں کہ عورت کی آزادی، خود مختاری اور شناخت کے دعوے کس حد تک حقیقی ہیں اور کہاں وہ محض سماجی سراب اور نمائشی بیانیے کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

حوالہ جات

1.Saadia Begum, Economic Empowerment and Stability of Women: An Analytical Study of Pakistani Society in the Light of the Prophetic Seerah, Al-Qawārīr, Vol. 07, Issue 01, 2025, pg 70

2۔ سورۃ النسا،4:32

3 Khubaib Usmani/Mahmood ul Hasan, Women's entrepreneurial capabilities: Cultural and Social Challenges, Al-Qawārīr -Vol: 06, Issue: 01, Oct–Dec2024, pg 71

4۔ نجیبہ عارف، میٹھے نلکے، اکادمی بازیافت، اسلام آباد، کراچی، 2022ء، ص20

5۔ ایضاً، ص21

6۔ ایضاً، ص21

7۔ شہناز نقوی،
نجیبہ عارف کے افسانوی مجموعے "میٹھے نلکے "کا تجزیہ۔ شہناز نقوی Ilmu - علمو

8۔ نجیبہ عارف، میٹھے نلکے، ایضاً، ص123

9۔ ایضاً، ص127

10۔ ایضاً، ص129

11۔ ایضاً

12۔ ایضاً

13۔ Shabana Muhammad Anwar/ Fateh Mohammad Burfat, The Effects of Harassment of Working Women at Male Dominated Workplace, Pakistan Journal of Social Sciences (PJSS) Vol. 41, No. 1 (2021), pp.239

14۔ نجیبہ عارف، میٹھے نلکے، ایضاً، ص130

15۔ ایضاً

16۔ Michelle Corinaldi, Motherhood in the Workplace: A Sociological Exploration into the Negative Performance Standards and Evaluations of Full-Time Working Mothers, PHILOLOGIA, 11, no. 1 (2019): pp. 15

17۔ نجیبہ عارف، میٹھے نلکے، ایضاً، ص131

18۔ ایضاً، ص132

19۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور عورت، تاریخ پبلی کیشنز، فکشن ہاؤس، لاہور، 1996ء ص18

20۔ نجیبہ عارف، میٹھے نلکے، ایضاً، ص132

21۔ ایضاً، ص128

22۔ ایضاً، ص81-82

23۔ ایضاً، ص12

24۔ ایضاً، ص84